بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا اور یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے، اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک، اور اختلافات میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ تو درکنار، ایک گھر بھی بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں اور ایک کامیاب نظامِ زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو روکا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیری ترقی ہوئی ہے اُسی وقت ہوئی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اصول پا لیے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں اور اس اتفاق میں ایسی گنجائشیں رکھ لی گئی ہوں کہ اختلافِ طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

پاکستان میں پچھلے آٹھ سال سے جو صورتِ حال رونما ہے اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ اتفاق کی بنیادیں تلاش کرنے میں ہماری ناکامی ہے۔ ہمیں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنے کا

اختیار حاصل ہوئے آٹھ سال گزر چکے ہیں، مگر جہاں ہم پہلے روز کھڑے تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں۔ بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے، اختیار پاکر بھی ہم ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے کوئی کامیاب اور قابلِ ذکر کوشش نہ کر سکے۔ ہمارا دستور وہی ہے۔ انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے۔ تعلیمی نظام وہی ہے۔ معاشی نظام وہی ہے۔ اخلاق و معاشرت کا حال وہی ہے۔ مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی ہم کوئی قدم نہ اٹھا سکے، بلکہ قدم اٹھانے کے لیے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لیے ہماری سعی و جہد تو اسی غرض کے لیے تھی کہ ہم غلامی کے دور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی موثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں آٹھ سال سے اختلافات کی فصل بہار آئی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نت نئی شان سے اُبھرتے رہے ہیں اور ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے دوسرا اس میں مزاحم ہوتا ہے، اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے کوئی تیسرا اسے بگاڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورتِ حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں اختلاف اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے افاقہ پانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے ذہن کو اُن بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیے جن پر سب، یا کم از کم اکثر باشندگانِ پاکستان متفق ہو سکیں، جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔ ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجوہِ نزاع کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا زاویۂ نظر بدل جائے تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔ ہم انہیں اپنے مذہب میں

پاسکتے ہیں، اپنی تہذیب اور روایات میں پاسکتے ہیں، دنیا کے تجربات میں پاسکتے ہیں اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پاسکتے ہیں۔

یہ سطور اسی غرض سے لکھی جارہی ہیں کہ چند اُن بنیادی اصولوں کی نشان دہی کی جائے جن پر اتفاق ممکن ہے تاکہ سوچنے والے اُن پر غور کریں۔

سب سے پہلے ہم اُن اصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تخریبی فضا کے بجائے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں، اس لیے کہ اگر فضا ہی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔

اولین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیے وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمانداری کے ساتھ ہو، دلائل کے ساتھ ہو، اور اسی حد تک رہے جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے، تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح مختلف نقطۂ نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کرسکتے ہیں کہ ان میں سے کس کو قبول کریں۔ تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اُس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اصول اختیار کرکے اُس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے، اُس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے، اُس کے نقطۂ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلاف ہو تو اسے غدار اور دشمنِ وطن ٹھیرائے، مذہبی اختلاف ہو تو اُس کے پورے دین و ایمان کو متہم کرڈالے، اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتے اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تلخی پیدا ہوجاتی ہے جو تعاون و تفاہم کے لیے نہیں بلکہ صرف تصادم و منافرت ہی کے لیے سازگار ہوتی ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی منفعت کا کوئی پہلو ہو تو ہو، مگر بحیثیت

مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر خود وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس بیہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو، ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے، اختلافات میں رواداری، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش اور دوسروں کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا ہے۔ کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے، لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا۔ پھر اس پر مزید خرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی، لہٰذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے"۔ یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اختلاف کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے، اور معاشرے کے مختلف عناصر کو جنہیں بہرحال ایک ہی جگہ رہنا ہے، اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت و مصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک مدت دراز تک معاشرے کے عناصرِ ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے، یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بدقسمتی سے نارواداری اور بدگمانی اور خودپسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں۔ حکومت اور اس کے اربابِ اقتدار اس میں مبتلا ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں۔ مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں تک اس کے زہریلے اثرات اتر گئے ہیں۔ اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں، اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیر اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعتِ ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام ان لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں یہ ہے کہ

ہر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صرف کرے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے، مگر اس نفی کو اسی حد تک رہنا چاہیے جس حد تک وہ ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیے نہ کہ نفی۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ بعض لوگ تو اس منفی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں، اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اُس کی اور اس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے۔ یہ ایک نہایت غلط طریق کار ہے اور اس سے بڑی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے تعصبات ابھرتے ہیں۔ اس سے عام بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے جو ایک قیادت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جانے اور دوسری کسی قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے، کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو مجتمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہو گا۔ لیکن اگر صورت حال یہ رہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا رہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بن سری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدۂ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیے یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر سے نہیں بلکہ دلائل سے منوائے، اور جو کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ بزور نافذ کرنے کے بجائے ترغیب و

تلقین سے لوگوں کو راضی کر کے نافذ کرے محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا ہے، اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اُٹھے اور زبردستی اس کو لوگوں پر مسلّط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریقِ کار کا لازمی نتیجہ کشمکش، مزاحمت اور بدمزگی ہے ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلّط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا مال و دولت کی یا نفوذ و اثر کی، وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس طاقت کا استعمال کافی ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے، ملکوں کے نظام تہ و بالا کر دیے ہیں، اور ان کو پُرامن ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر بے تکے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے با اثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اور اسی طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملّت کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیے۔ ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا، یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا، یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی نہ کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لیے معرکہ آرائی پر اتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کے لیے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جائے اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے جس کے بُرے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح

ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے بھی اس کا تعلق ہو اُس کے ساتھ اُس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی، تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے، اور تعصب کے مقابلے میں تعصب کشمکش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھلا اُس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحۂ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ "ملک کی بھلائی" ہی کے لیے خواہاں اور کوشاں ہوں۔ اور دوسری شرط یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت، یا مصالحت اصولی ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہوگی اُس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کی پروا نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ قزاقوں کی ٹولی ہے۔ اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار و اقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو ان کی جنگ بھی ملک کے لیے تباہ کن ہو گی اور صلح بھی۔

یہ پانچ اصول تو وہ ہیں جن کی پابندی اگر ملک کے تمام عناصر قبول نہ کرلیں تو یہاں سرے سے وہ فضا ہی پیدا نہیں ہو سکتی جس میں انتظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتفاق ممکن ہو، یا بالفرض اس طرح کا کوئی اتفاق معجزانہ طور پر واقع ہو بھی جائے تو وہ عملاً کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مصالحانہ فضا میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ ملک کا انتظامِ زندگی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

ان میں سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو ملک کے آئندہ نظام کے لیے منبعِ ہدایت اور اولین ماخذِ قانون تسلیم

کیا جائے۔ اس کو بنیادِ اتفاق ہم اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور وہ اس بنیاد کے سوا کسی اور چیز پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اُن کا عقیدہ اس کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی تہذیب اور قومی روایات اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور ان کی ماضی قریب کی تاریخ بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کے لیے یہ گوارا کرنا سخت مشکل بلکہ محال ہے کہ جس خدا اور جس رسول پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کے احکام سے وہ جان بوجھ کر منہ موڑ لیں اور اس کی ہدایات کے خلاف دوسرے طریقے اور قوانین خود اپنے اختیار سے جاری کریں۔ وہ کبھی اُن طریقوں کو جاری کرنے میں سچے دل سے تعاون نہیں کر سکتے اور نہ اُن قوانین کی برضا و رغبت پیروی کر سکتے ہیں جن کو وہ عقیدۃً باطل اور غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر انہوں نے جان و مال اور آبرو کی ہولناک قربانیاں دیں وہ صرف یہ تھی کہ انہیں غیر اسلامی نظامِ زندگی کے تحت جینا گوارا نہ تھا اور وہ اسے اسلامی نظامِ زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ اب ان سے یہ توقع کرنا بالکل بے جا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بخوشی اس اصل مقصد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے لیے انہوں نے اتنی گراں قیمت پر آزادی خریدی ہے۔ بلاشبہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اگر کوئی جابر طاقت زبردستی ان کے اس مقصد کے حصول میں مانع ہو جائے اور اُن پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ حیات مسلط کر دے تو وہ اُسی طرح مجبوری کے ساتھ اسے برداشت کر لیں جس طرح انگریزی تسلط قائم ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے برداشت کیا تھا، لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایک ناراضامند آبادی پر جبر سے ایک نظام مسلط کر کے اسے کامیابی کے ساتھ چلایا بھی جا سکتا ہے وہ یقیناً سخت نادان ہے۔

جن لوگوں کو اس بنیاد سے اتفاق نہیں ہے وہ چار طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ایک، وہ مسلمان جو اخلاق، تہذیب اور معاشرت میں اس حد تک مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انہیں اسلامی طرزِ زندگی کی طرف پلٹنے کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دوسرے، وہ مسلمان جو مسلمان ہونے سے تو منکر نہیں مگر مغربی افکار و نظریات سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ انہیں اب اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص رجحانات کے سبب سے ایک لادینی (سیکولر) نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ وہی ان کے مزاج و مذاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ تیسرا طبقہ اُن مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں۔ اور چوتھے طبقے

میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں جو مسلمانوں کے دینی نظام کی بہ نسبت ایک غیر دینی نظام کو ترجیح دیتی ہیں۔

ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ اب کیا یہ انصاف ہے کہ ملک کا نظام اُس بنیاد پر تو تعمیر نہ ہو جسے کروڑوں آدمی چاہتے ہیں اور اُس بنیاد پر تعمیر ہو جسے چاہنے والے چند ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں؟ اور اگر بالفرض ایسا کیا بھی جائے تو کونسی طاقت ایسے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ان کروڑوں آدمیوں کا قلبی تعاون حاصل کرے گی؟ ہم ان حضرات سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے خیالات کو یک لخت تبدیل کر دیں۔ البتہ جو بات ہم ان سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ملک کی بھلائی ایسی ہی بنیادوں پر اُس کا نظام زندگی تعمیر کرنے میں ہے جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق ممکن ہو، اور یہ اتفاق بہر حال لادینی پر یا قرآن بلا سنت پر ممکن نہیں ہے، لہٰذا آپ اپنے خیالات جو کچھ بھی چاہیں رکھیں، مگر مزاحمت چھوڑ دیں۔

رہے ہمارے غیر مسلم ہم وطن، تو انہیں پہلے بھی بارہا اطمینان دلایا جا چکا ہے، اور اب بھی یہ اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی جائیگی کہ مسلمانوں کا مذہب آپ پر مسلط نہیں کیا جائے گا، آپ کے مذہب اور تہذیب میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی، آپ کا پرسنل لا آپ کے لیے محفوظ رہے گا، اور آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہاں عملاً اُس سے زیادہ حقوق حاصل ہونگے جو دنیا میں کہیں اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ مطالبہ آخر کس بنا پر حق بجانب ہو سکتا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کی مرضی کے بجائے اقلیت کی مرضی کے مطابق بنے؟ اور اگر یہاں آپ کے مذہبی قوانین کو رائج نہیں ہونا ہے تو آپ کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے کہ یہاں کے ملکی قوانین اسلامی قانون کے اصولوں پر مبنی یا رومن لا کے اصولوں پر؟ آپ کے لیے دونوں یکساں اجنبی ہیں۔ پھر کس بنا پر آپ ان میں سے ایک کے مخالف اور دوسرے کے طالب ہیں؟

قرآن و سنت کو بنیاد بنانے کے خلاف ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کی تعبیروں میں بکثرت اختلافات ہیں اور کوئی ایک تعبیر متفق علیہ نہیں ہے۔ رہی سنت، تو اس میں صرف تعبیرات ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر ملک کی آبادی کا کثیر حصہ متفق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی خاص تعبیر کو نہیں بلکہ بجائے خود قرآن کو، اور سنت کے متعلق کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ بجائے خود سنتِ رسول اللہ کو نظامِ زندگی کی بنیاد قرار دے رہے ہیں، اور یہ بنیاد ایک ناقابلِ لحاظ اقلیت کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ رہے اختلافات، تو وہ دو طریقوں سے بآسانی حل ہو سکتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ مسلمانوں میں جو گروہ معتدبہ تعداد میں پائے جاتے ہیں (مثلاً حنفی، اہل حدیث، شیعہ) ان سے تعلق رکھنے والے معاملات پر قرآن کی اسی تعبیر اور سنت کی اسی تشریح کا اطلاق ہو جو ان کے نزدیک مسلّم ہو۔

دوم یہ کہ جو معاملات تمام ملک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں وہ تعبیر و تشریح عملاً تسلیم کی جائے جس پر اکثریت متفق ہو، اور اقلیت کے لیے یہ حق باقی رہے کہ وہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اکثریت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

آئندہ صحبت میں ہم بقیہ بنیادوں پر مفصل گفتگو کریں گے۔ اس وقت جگہ کی قلت کے باعث یہ بحث ملتوی کی جاتی ہے۔

ایک محترم بزرگ نے مجھے تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۴۱ کے حاشیہ نمبر ۱۸۳ کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "پھر ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض، مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا"

اس کے متعلق انہوں نے فرمایا ہے کہ "اس میں یہ تصریح نہ ہونے سے کہ مریض وغیرہ کو بعد میں قضا

کے روزے رکھنے چاہئیں، آدمی اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ ان کے لیے صرف فدیہ دے دینا ہی کافی ہے۔"
میں نے اس خیال سے اس مسئلے کی تصریح نہ کی تھی کہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی یہ فرما دیا ہے کہ وَمَنْ
كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں
میں روزوں کی تعداد پوری کرے)۔ لیکن جبکہ اس سے ایک عام ناظر کو غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے تو مناسب
یہی ہے کہ حاشیہ کے آخر میں حسب ذیل فقرے کا اضافہ کر دیا جائے:

"اور انہیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے ہی روزے رکھ لیں
جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہوں۔"